اسلامی قانون

ایک عمومی تعارف

دوسری اور آخری قسط

محمود احمد غازی

انسانی زندگی پر محیط یہ جامع ہدایت نامہ فقہ اسلامی کے وسیع و عمیق اور بے مثال ذخیرہ سے عبارت ہے۔ فقہائے اسلام نے تعلیم و تفہیم کی سہولت کی خاطر اس کے مضامین و مندرجات کو متعدد انداز سے تقسیم کیا ہے۔ بعض حضرات اس کی تقسیم عبادات اور عادات کے دو عمومی موضوعات کی تحت کرتے ہیں۔ یعنی وہ احکام جن کا مقصد اللہ اور بندہ کے درمیان تعلق کو مضبوط بنانا ہے اور وہ احکام جو بندوں کے مابین تعلقات کو منضبط کرتے ہیں۔ بعض دیگر حضرات نے امور تعبدی اور امور تابدی کی اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔ کچھ اور حضرات نے عبادات، عادات اور معاملات کی سہ گانہ تقسیم کو زیادہ موزوں قرار دیا ہے۔

تاہم دور جدید کے فقہائے اسلام کا رجحان زیادہ تفصیلی تقسیم کا ہے۔ وہ فقہ کے موضوعات و مضامین کو جدید مغربی قانون کی اصطلاحات میں بیان کرنا موزوں سمجھتے ہیں جس کا سب سے بڑا فائدہ قانون دان حضرات اور جج صاحبان کی بہ سہولت تفہیم ہے۔ جن حضرات نے جدید قانونی اصطلاحات میں یہ تقسیمیں کی ہیں ان میں شام کے نامور فقیہ استاذ علامہ مصطفیٰ احمد الزرقا، عراق کے فقیہ ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، مصر کے ڈاکٹر عبدالسلام مدکور اور بہت سے دوسرے حضرات شامل ہیں۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ اگرچہ یہ تقسیمیں نئی ہیں، لیکن یہ مضامین اور ان کی قدیم اصطلاحات اتنی ہی قدیم ہیں جتنی خود فقہ اسلامی قدیم ہے۔ پہلی صدی ہجری کے اواخر سے فقہی مضامین کو پیش کرنے کی جو ترتیب اختیار کی گئی تھی وہ آج تک چلی آرہی ہے۔ اور بہت کم فقہی کتابیں ایسی ملیں گی جن میں اس ترتیب سے انحراف کیا گیا ہو۔ اگر کوئی فرق کہیں نظر آتا ہے تو وہ عام طور پر جزوی قسم کا ہی ہے، بنیادی اور جوہری قسم کا نہیں ہے۔

یہ کہنا تو بڑا دشوار ہے کہ فقہی کتابوں کی یہ ترتیب سب سے پہلے کس فقیہ نے قائم کی لیکن یہ بات واضح ہے کہ فقہ کی قدیم ترین کتابوں (امام مالک، امام محمد بن حسن الشیبانی اور امام شافعی وغیرہ کی تصانیف) میں فی الجملہ یہی ترتیب اختیار کی گئی ہے۔ اس ترتیب میں ایک عقلی اور منطقی ارتقا پایا جاتا ہے۔ ایک عام مسلمان کو جن مسائل و معاملات سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سابقہ پڑتا ہے وہ سب سے پہلے بیان کیے جاتے ہیں۔ پھر بالتدریج جیسے جیسے اپنی اہمیت کے اور انسان سے اپنے سابقہ کے لحاظ سے مضامین آتے ہیں فقہ کی کتابوں میں ان کی بحثیں آتی جاتی ہیں۔ اس لیے عموماً سب سے پہلے طہارت اور پھر نماز کے احکام بیان ہوتے ہیں اور پھر درجہ بدرجہ دوسرے احکام کا نمبر آتا ہے۔

اس ترتیب اور استاد زرقا اور ڈاکٹر عبدالکریم زیدان کی تقسیم کے لحاظ سے فقہ کی کتابوں کے مندرجات کو درج ذیل بڑے بڑے عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ عبادات۔ یہ فقہ اسلامی کا اولین موضوع ہے جس سے فقہ کی ہر کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ عبادات میں ترتیب کے اعتبار سے پہلے نماز، پھر روزہ پھر زکوۃ اور آخر میں حج کا تذکرہ آتا ہے۔ اس ترتیب میں یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ ذاتی اور انفرادی طور پر ادا کی جا سکنے والی عبادات پہلے آئیں اور پھر بالتدریج وہ عبادات آئیں جو اجتماعیت کی شان زیادہ رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ عبادات پہلے آتی ہیں جن کی فرضیت کا دائرہ نسبتاً وسیع تر ہے اور وہ عبادات بعد میں آتی ہیں جن کا فرضیت کا دائرہ نسبتاً محدود ہے۔ مثال کے طور پر نماز کو لیجیے۔ یہ عبادت ہر شخص انفرادی طور پر ہی ادا کرتا ہے اور عام حالات میں یہ اللہ اور بندے کے درمیان ایک خصوصی رشتے کے طور پر ہی قائم رہتی ہے جس میں ریاست یا کوئی ریاستی ادارہ کوئی مداخلت نہیں کرتا۔ تاوقتیکہ کوئی شخص یا گروہ ترک نماز کی مجاہرت نہ شروع کر دے یعنی علی الاعلان ترک نماز کرے اور رائے عامہ کے ردعمل کو حقیر جان کر نظرانداز کرے۔ اس کے بعد روزہ کو لیجیے۔ یہ اگرچہ انفرادی طور پر ہر ایک کا اپنا اپنا فعل ہے لیکن اس میں اجتماعیت کی ایک عجیب شان پائی جاتی ہے۔ اس میں ریاست کی مداخلت کی حدود اور سطح نماز کے مقابلہ میں ذرا زیادہ لیکن زکوۃ کے مقابلے میں کم ہے۔ زکوۃ وہ عبادت ہے جو انفرادی طور پر ادا ہی نہیں کی جا سکتی۔ اس میں کم از کم ایک شخص کی موجودگی ضروری ہے جو زکوۃ وصول کر کے آپ کو زکوۃ ادا کرنے کا موقع فراہم کرے۔ آخر میں حج کا مرحلہ آتا ہے جس میں اسلام کی بین الاقوامیت اپنی بھرپور شکل میں سامنے آتی ہے۔ ان سب عبادات کے تفصیلی احکام سے فقہ کے جس حصہ میں بحث ہوتی ہے اس کو فقہ العبادات کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ مناکحات، احوال شخصیہ یا فقہ الاسرہ: یہ فقہ کا وہ حصہ ہے جو انسان کی عائلی زندگی کو منظم و

منضبط کرتا ہے۔فقہ الاسرہ کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن پاک کی کل آیات احکام کا (جن کی تعداد کا اندازہ ۲۵۰۔۳۰۰ کے درمیان ہے) کم و بیش ایک تہائی یا اس سے کچھ زائد صرف شخصی اور عائلی قوانین سے متعلق ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نظام معاشرت و قانون میں ادارہ خاندان کو بڑی بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ خاندان اور نسل کا تحفظ اسلام کے پانچ بنیادی مقاصد میں سے ایک قرار دیا جاتا ہے۔قرآن مجید میں ایسی کاوشوں کو کافرانہ سحر کاری کہا گیا ہے جن کا مقصد خاندان کے دو بنیادی ستونوں' شوہر اور بیوی' کے درمیان دوری اور تفریق پیدا کرنا ہو۔رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے بھی ایسی کوششوں کو ابلیسی کوششیں قرار دیا ہے جن کے ذریعہ شوہر اور بیوی میں نفرت کے بیج بوئے جائیں۔یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام نے خاندان میں خوش گوار تعلقات کے فروغ اور شوہر اور بیوی میں محبت کا جذبہ استوار کرنے کی کوششوں کو نفل عبادات سے بڑھ کر ٹھہرایا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور امت کی تکوین میں سب سے بنیادی اکائی خاندان ہی ہے۔اگر خاندان کی اکائی مضبوط اور اسلامی اساس پر قائم ہے تو وہاں سے جو افراد تیار ہوں گے وہ بنیادی دینی تربیت کے حامل ہوں گے اور ایسے خاندان سے جو معاشرہ بنے گا وہ اسلامی اساس سے قریب تر ہو گا۔

فقہ الاسرہ یا عائلی قوانین کے ذیل میں نکاح' طلاق' وراثت' وصیت' نفقہ اور حضانت کے ابواب سے بحث ہوتی ہے۔یعنی ادارہ خاندان وجود میں کیسے آئے گا' اگر وجود میں آنے کے بعد اختلافات جنم لینے لگیں تو ان کو کیسے دور کیا جائے۔مرنے والے کی جایداد افراد خاندان میں کیسے اور کس تناسب سے تقسیم کی جائے اور افراد خاندان کی ضروریات کی تکمیل اور مفادات کی نگہداشت کیسے کی جائے۔قطع نظر اس کے کہ افراد خاندان کا مذہب اور عقیدہ کیا ہے' ان کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی ضروریات کی تکمیل' شریعت کے احکام کا بنیادی تقاضا ہے۔

۳۔ معاملات: منطقی اور واقعاتی ترتیب کے اعتبار سے دیکھا جائے تو گھریلو زندگی کے بعد انسان کی معاشرتی زندگی آتی ہے جس میں اس کو لوگوں سے لین دین' خرید و فروخت اور مال و دولت سے متعلق معاملات کرنے پڑتے ہیں۔یہ معاملات دو طرح کے ہوتے ہیں: کچھ تو وہ جن میں فریقین کے قانونی حقوق و فرائض مرتب ہوتے ہوں اور کچھ وہ جن کے نتیجہ میں ایسے قانونی حقوق و فرائض مرتب نہ ہوتے ہوں جن کو عدالتوں کے ذریعہ نافذ کرایا جاسکتا ہو۔ان میں سے پہلی قسم کا اصطلاحی نام فقہ المعاملات ہے۔یہ فقہ اسلامی کا سب سے وسیع اور سب سے عمیق میدان ہے۔عام طور پر آج کل کے جدید فقہا اس کو اسلام کا دیوانی قانون قرار دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ دیوانی قانون یا سول لا کے نام سے یورپ میں بالعموم اور فرانس میں بالخصوص قانون کے جس شعبہ کو دیوانی قانون کہا جاتا ہے

اس کا بڑا حصہ فقہائے اسلام کی تقسیم کی رو سے معاملات میں زیر بحث آتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ فقہ المعاملات کا دائرہ جتنا وسیع ہے اس کے لحاظ سے اس کو دیوانی قانون کے مترادف قرار دینا درست نہیں معلوم ہوتا۔

فقہ المعاملات میں وہ تمام احکام شامل ہیں جن کا تعلق افراد یا گروہ کے مابین لین دین اور تجارتی قسم کے تعلقات سے ہے۔ آج کل عرب فقہا نے فقہ المعاملات کو بہت سی ذیلی شاخوں میں تقسیم کیا ہے جن میں سے چند یہ ہیں:

الف۔ فقہ مالی: یعنی فقہ کے وہ احکام جو اسلام کے مالیاتی نظام کو منظم و منضبط کرتے ہیں۔ اس میں اسلام کا تصور مال' مال کی قسمیں' حصول مال' توسیع مال وغیرہ کے احکام شامل ہیں۔

ب۔ فقہ اقتصادی: یعنی فقہ کے وہ احکام جو اسلام کے معاشی اور اقتصادی نظام کو منظم و منضبط کرتے ہیں۔ اس میں ملکیت کا تصور' ریاست کے ذرائع آمدنی' محاصل عامہ' ریاست کی معاشی ذمہ داریاں وغیرہ زیر بحث آتی ہیں۔ اس شاخ کے بعض احکام سے اسلام کے دستوری اور انتظامی قانون میں بھی بحث کی جاتی ہے۔

ج۔ فقہ تجارتی: یعنی فقہ کے وہ احکام جو اسلام کے تجارتی نظام کو منظم و منضبط کرتے ہیں۔ اس میں تجارت اور کاروبار کی قسمیں' کاروباری شریکوں کے باہمی روابط' مشترکہ یا انفرادی کاروبار' مشترکہ کاروبار کی صورت میں متعلقہ شرکا کے حقوق اور ذمہ داریوں سے بحث کی جاتی ہے۔ اسی عنوان کے تحت اسلام میں کارپوریٹ قانون کے تصور پر بھی بحث ہوتی ہے۔ فقہائے اسلام نے زمانہ قدیم سے ذمہ داری کے محدود یا غیر محدود ہونے اور اس کی بہت سی صورتوں سے بھی بحث کی ہے۔

۴۔ فقہ العقود: یعنی اسلام کا قانون معاہدہ۔ اس میں معاہدوں کی قسموں ان کے احکام اور نتائج و ثمرات سے بحث کی جاتی ہے۔ فقہائے اسلام نے جن معاہدہ جات سے اپنی کتابوں میں بحث کی ہے ان کو چار زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ عقود المعاوضہ' یعنی وہ معاہدے جن میں ایک فریق دوسرے فریق کو اس کی کسی خدمت کا معاوضہ پیش کرتا ہے۔ ۲۔ عقود المشارکہ' یعنی وہ معاہدے جن میں دونوں فریق کسی مشترک مقصد کے لیے شریک ہوں۔ ۳۔ عقود التوثق' یعنی وہ معاہدے جن کا مقصد ایک فریق کو دوسرے فریق کے واجب الادا حقوق کی ادائیگی کا پابند بنانا ہو۔ مثلاً معاہد رہن۔ ۴۔ عقود المبادلہ: یعنی وہ معاہدے جن کا مقصد دو فریقوں کے مابین جایداد کا تبادلہ ہو۔ بعض حضرات اس قسم کو عقود المعاوضہ ہی کی ایک قسم قرار دیتے ہیں۔

اسقاطات و ابرات: یعنی فقہ المعاملات کا وہ حصہ جو انسان کے ان تصرفات سے بحث کرتا ہے جن کا مقصد اپنے کسی حق کو ساقط کرنا یا دوسرے پر عائد ہونے والی ذمہ داری سے ان کو بری کرنا ہو۔

و۔ ذمہ اور التزامات : یعنی وہ مالی ذمہ داریاں (liabilities) جو انسان پر عاید ہوتی ہیں اور ان کے نتیجہ میں بہت سے صورتیں کاروبار اور معاہدہ جات وغیرہ کی سامنے آتی ہیں۔

۴۔ الاحکام السلطانیۃ : سیاست شرعیہ یا فقہ دستوری، یہ فقہ اسلامی کا چوتھا بڑا میدان ہے جو اسلام کے دستوری اور انتظامی قانون سے بحث کرتا ہے۔ مسلم مفکرین اور فقہا کے نزدیک قانون اور نظام کی پابندی انسان کی بنیاد اور سرشت میں داخل ہے۔ وہ انسان کو محض معاشرتی حیوان نہیں مانتے بلکہ ایک ایسا سیاسی حیوان مانتے ہیں جو قانون اور نظم وضبط کی شعوری پابندی کرتا ہے۔ رومی قانون دانوں نے بھی شاید مسلمانوں کے اثر سے یہ کہا کہ جہاں معاشرہ ہو گا وہاں قانون بھی ہو گا۔ پھر جہاں قانون ہو گا وہاں قانون بنانے والے اور چلانے والے بھی ہوں گے۔ پھر وہاں قانون کو نافذ کرنے والے اور قانون کو توڑنے پر سزا دینے والے بھی ہوں گے۔ یہ فقہ اسلامی کا وہ شعبہ ہے جو بجا طور پر اسلام کا دستوری اور انتظامی قانون کہلاتا ہے۔ اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں (ان میں سے متعدد کتابیں الاحکام السلطانیہ اور سیاست شرعیہ کے نام سے موسوم ہوئیں) وہ دستوری فکر، دستوری قانون اور دستوری نظائر کے ساتھ ساتھ انتظامی قانون سے بھی بحث کرتی ہیں۔ انتظامی قانون کے ضمن میں ایسے معاملات بھی زیر بحث آتے ہیں جو قبل ازیں فقہ المعاملات میں ذکر کیے جا چکے ہیں۔ مثلاً فقہ مالی کے وہ مسائل جو ریاست کے فرائض سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ ماوردی (متوفی ۴۵۰ھ) نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیہ میں محاصل عامہ وغیرہ سے متعلق بہت سے ایسے مباحث شامل کیے ہیں جو اصلاً فقہ مالی سے تعلق رکھتے ہیں۔

۵۔ فقہ الجنایات : یعنی اسلام کا فوج داری قانون۔ جہاں قانون ہو گا وہاں قانون کو توڑنے والے بھی ہوں گے۔ قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی معاشرہ ایسا نہیں گزرا جس میں جرائم کا ارتکاب کرنے والے ناپید ہو گئے ہوں۔ بہترین سے بہترین معاشروں میں بھی جرائم کا ارتکاب ہو جاتا ہے۔ جرائم کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان کو کم سے کم سطح پر لے آیا جائے، معاشرہ میں جرم کا ارتکاب انتہائی استثنائی صورت ہو جس سے معاشرے کا مزاج ابا کرتا ہو اور عام لوگ اس سے نفرت کرتے ہوں۔ جرم کا ارتکاب علانیہ نہ ہو، ایک بار جرم ہو جانے پر قرار واقعی سزا دی جائے اور دوسرے ممکنہ مجرمین کے لیے اس کو عبرت اور مثال بنا دیا جائے۔

جرائم کی سزائیں اور ان کا قانون وضع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے جرم کا تعین کیا جائے اور کسی فعل کو کب، کن حالات میں اور کن شرائط کے تحت جرم قرار دیا جائے گا۔ وہ اسباب اور بنیادیں کون اور کن اصولوں کی اساس پر متعین کرے گا جن کی روشنی میں کسی فعل کو جرم قرار دیا جائے۔ پھر جو افعال جرم قرار دیے جائیں گے ان کی سزائیں کیا ہوں گی اور ان کا تعین کون اور کن

اصولوں کی بنیاد پر کرے گا' پھر سزائیں کب اور کن حالات میں دی جائیں گی اور کب اور کن حالات میں ان کو معاف یا ختم یا کم کیا جاسکے گا۔

اس باب میں شریعت نے جو بنیادی احکام دیے ہیں ان کی رو سے اول انسانوں کے حقوق و فرائض کی وضاحت کی گئی ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا تذکرہ ہے اور ان حقوق کی وضاحت ہے جن میں اللہ اور بندوں دونوں کے حقوق پائے جاتے ہیں۔ ان تینوں قسم کے حقوق کے الگ الگ احکام اور تقاضے ہیں جن کی بنیاد پر جرائم کی تین تقسیمیں بنتی ہیں۔ پھر کچھ جرائم ایسے ہیں جو ہر معاشرہ میں پائے جاتے ہیں اور دنیا کا کوئی علاقہ یا ملک ان سے خالی نہیں ہوتا۔ جیسے چوری' بدکاری' قتل' نشہ بازی وغیرہ۔ ایسے جرائم کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ دوسری قسم کے جرائم وہ ہیں جو خاص خاص علاقوں' ملکوں' معاشروں یا حالات میں پیدا ہوتے ہیں اور ہر جگہ عام نہیں ہوتے۔ مثلاً ملاوٹ اور رشوت کے جرائم کہ وہ بعض علاقوں اور معاشروں میں پائے جاتے ہیں اور بعض میں نہیں پائے جاتے۔ اس نوعیت کے جرائم تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں۔

ان میں سے پہلی نوعیت کے جرائم کی سزائیں شریعت نے متعین کر دی ہیں اور وہ ہمیشہ کے لیے طے شدہ ہیں۔ ان سزاؤں کو اصطلاحاً حدود کہا جاتا ہے۔ دوسری نوعیت کے جرائم کی سزائیں شریعت نے خود متعین کر دینے کے بجائے ان کا تعین کرنے کا کام معاشرہ کے سپرد کر دیا ہے۔ اب یہ اس متعلقہ معاشرہ یا علاقہ کے ارباب حل و عقد کی ذمہ داری ہے کہ وہ جرم کی نوعیت' وسعت اور اثرات کو دیکھ کر اس کی کوئی مناسب سزا مقرر کر دیں۔ سزاؤں کی اس قسم کو تعزیر کہا جاتا ہے۔ حدود کے برعکس تعزیری سزائیں ہمیشہ کے لیے طے شدہ نہیں ہیں بلکہ معاشرہ کے ارباب حل و عقد حالات و ضروریات کے پیش نظر ان میں مناسب ردوبدل کرتے رہنے کے مجاز بلکہ مکلف ہیں۔

پھر حقوق اللہ اور حقوق العباد کے حوالے سے بھی جرائم کی تقسیمیں ہیں۔ جن جرائم میں حقوق العباد کا پہلو غالب قرار دیا گیا ہے ان میں بندوں کو معاف کر دینے کا اختیار نہیں ہے۔ پہلی قسم کے جرائم میں قتل اور انسانی جان کے خلاف تمام جرائم شامل ہیں جن میں قصاص اور دیت کی سزائیں دی گئی ہیں۔ دوسری قسم کی سزاؤں میں حدود شامل ہیں۔ تعزیرات اگرچہ بیشتر حقوق اللہ میں شامل ہیں لیکن ان میں حاکم وقت کو معاف کرنے یا کمی کرنے کا اس لیے اختیار ہے کہ یہ سزائیں اسی کی مقرر کی ہوئی ہیں۔

۶۔ فقہ اسلامی کا چھٹا بڑا میدان ادب القاضی ہے جس کو بعض جدید عرب مصنفین فقہ المرافعات کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ یہ اسلامی قانون کا وہ شعبہ ہے جس کو آج کل کی اصطلاح میں قانون ضابطہ یا پروسیجرل لا (procedural law) کہا جاسکتا ہے۔ اس عنوان کے تحت فقہائے اسلام

حسب ذیل موضوعات سے بحث کرتے ہیں:

الف۔ نظام قضا عدلیہ جو اسلام کے نظام عدل و احسان کے قیام کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام میں عدلیہ اور قضا کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن پاک میں خلافت کا سب سے بڑا اور اولین فریضہ اور مقصد لوگوں کے درمیان حق و انصاف کے مطابق مقدمات کے فیصلے کرنا قرار دیا گیا ہے۔ (سورہ ص: ۲۶)۔ عربی زبان میں حکومت اور عدلیہ کے لیے ایک ہی لفظ ہے (حکم، حکومہ، محکمہ) جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربی اسلامی مزاج یہ ہے کہ نظام حکومت میں قاضی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ قضا کے زیر عنوان فقہائے کرام منصب قضا کی اہمیت، کار قضا کی فضیلت، قاضی کے تقرر، قاضی کی شرائط، منصب قضا کی طلب، قاضی کے فرائض، قاضی کے عزل و تقرر، آداب عدالت، عہدہ داران عدالت، قاضی کی مراعات جیسے اہم موضوعات کا ذکر کرتے ہیں۔

ب۔ دعویٰ اور دعوی کے فریقین، وہ امور جن کا فیصلہ کرنے کے لیے عدالت میں جانا ضروری ہے اور وہ امور جن کا فیصلہ کرانے کے لیے عدالت میں جانا اور دعویٰ دائر کرنا ضروری نہیں، دعویٰ کے اسباب، ارکان اور شرائط، دعویٰ کے مندرجات، تعارض و تناقض وغیرہ۔

ج۔ سماعت اور فیصلہ کا طریقہ کار، دائرہ اختیار، سمن اور طلبی، آداب کمرہ عدالت، جواب دعویٰ، فیصلہ، حوالات اور حبس احتیاطی، فریق کی غیر حاضری میں فیصلہ، فیصلہ سے رجوع، فیصلہ پر نظر ثانی، فیصلہ کے اثرات۔

د۔ ثبوت اور گواہی، بینہ اور ثبوت، شہادت، نصاب شہادت، اوصاف گواہاں، گواہی کی شرائط، تزکیۃ الشہود، گواہوں کا اختلاف اور تضاد بیانی، قرینہ قاطعہ، ماہرین فن کی آرا، سرکاری اور عدالتی دستاویزات بطور ثبوت، اقرار، قسم، نکول (قسم کھانے سے انکار) وغیرہ۔

ھ۔ نیم عدالتی ادارے۔ حسبہ، ولایت مظالم، ولایت جرائم، نظام افتا، تحکیم اور ثالثی، وکالت اور قانونی مشورہ ادب القاضی کے مندرجات و موضوعات کے اس مختصر خاکہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا دائرہ کار مغربی پروسیجرل لا کے مقابلے میں خاصا وسیع ہے۔ اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ کسی کو مجرم قرار دینے یا بری کرنے کا کام حکمرانوں کی صواب دید پر نہ چھوڑا جائے کہ وہ جس کو چاہیں مجرم قرار دے دیں اور جس کو چاہیں سزا سنا دیں۔ بلکہ اس کے لیے ایک باقاعدہ قانونی ضابطہ اور اصول و قواعد ہوں جن کے بموجب کسی شخص کو مجرم یا بری قرار دیا جائے۔ اسی قانونی ضابطے اور انھی اصول و قواعد کے مجموعہ کا نام ادب القاضی ہے۔ یہ بات بلا خوف و تردد کہی جا سکتی ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں پروسیجرل لا کو ایک الگ اور جداگانہ قانونی علم کے طور پر سب سے پہلے مسلم فقہا نے مرتب کیا۔ دوسری صدی ہجری کے اواخر سے ادب القاضی کے موضوع پر الگ سے کتابیں لکھنے کی

ضرورت مسلمان فقہا نے محسوس کر لی تھی۔ امام ابو حنیفہ کے دو نامور شاگردوں امام ابو یوسف اور امام حسن بن زیاد اللؤلوی نے ادب القاضی کے نام سے کتابیں لکھی تھیں جو افسوس ہے کہ ہم تک نہیں پہنچ سکیں۔ اس وقت اس موضوع پر جو قدیم کتاب دستیاب ہے وہ تیسری صدی کے حنفی امام ابو بکر خصاف (متوفی ۲۶۱ھ) کی کتاب ادب القاضی ہے جو دنیا کے ذخیرۂ قانون میں پروسیجرل لا پر قدیم ترین کتاب ہے۔

اس گزارش کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ دوسری اقوام اور تہذیبوں میں پروسیجرل لا کا کوئی تصور مسلمانوں سے پہلے نہیں پایا جاتا تھا، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ عرض کرنا ہے کہ امام خصاف سے قبل کسی قانون دان نے صرف پروسیجرل لا کے موضوع پر الگ سے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ رومن قانون، حمورابی کے کوڈ، یہودی قانون، قدیم ہندو شاستروں میں بلاشبہ پروسیجرل اور ضابطہ کے احکام و قواعد ملتے ہیں لیکن وہ بنیادی قانون (substantive-law) کے قواعد میں اس طرح رلے ملے اور مخلوط ہیں کہ ان کو بعض صورتوں میں تو الگ الگ متمیز کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ ان قوانین میں یہ اندازہ کرنا دشوار ہوتا ہے کہ اصل اور بنیادی قانون کہاں ختم ہوتا ہے اور قانون ضابطہ کہاں شروع ہوتا ہے۔

۷۔ سیر یا الفقہ الدولی، اسلام کا بین الاقوامی قانون یا قانون بین الممالک۔

ادب القاضی کی طرح سیر کے بارے میں بھی بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انسانی تاریخ میں مسلمان فقہا نے پہلی بار بین الاقوامی قانون کو ایک باقاعدہ قانونی علم کے طور پر مدون کیا۔ یہ بات تاریخ اور ریکارڈ کا حصہ ہے جس کو مغربی اور مشرقی مصنفین دونوں نے تسلیم کیا ہے کہ امام محمد بن الحسن الشیبانی (متوفی ۱۸۹ھ ۸۰۵ء) کی کتابیں کتاب السیر الصغیر اور کتاب السیر الکبیر تاریخ قانون میں بین الاقوامی قانون کے موضوع پر مستقل بالذات لکھی جانے والی قدیم ترین کتابیں ہیں جو اپنی اصل صورت میں ہم تک پہنچی ہیں۔ مغربی دنیا میں ڈچ قانون دان ہیوگو گروشس (متوفی ۱۶۴۵ء مطابق ۱۰۵۵ھ) کو بین الاقوامی قانون کا باوا آدم (فادر آف انٹرنیشنل لا) مانا جاتا ہے۔ اس کی کتاب جس پر اس کی شہرت اور اس لقب کا دارومدار ہے یعنی قانون جنگ و صلح ۱۶۲۵ عیسوی میں منظر عام پر آئی تھی۔ جبکہ گروشس کی وفات سے تقریباً آٹھ سو چھیاسٹھ سال قبل امام محمد بن الحسن الشیبانی مذکورہ بالا دونوں کتابیں مرتب کر چکے تھے اور وہ دنیائے اسلام میں وسیع پیمانہ پر مقبول ہو چکی تھیں۔

امام محمد بن الحسن الشیبانی اور ان کے ہم عصر دوسرے فقہاکرام کی تصانیف سے قبل دنیا کی کسی قوم میں بین الاقوامی قانون پر مستقل بالذات کتابوں کا ذکر نہیں ملتا۔ اسلام سے قبل یا تو سرے سے جنگ و صلح کا کوئی قانون نہیں تھا یا عموماً مذہبی کتابوں میں دوسری بہت سی ہدایات کے ساتھ ساتھ

جنگ و صلح کے بارے میں ہدایات ملتی ہیں۔ بعض جدید مصنفین نے خاصی تگ و دو کے بعد اپنی اپنی اقوام میں انٹرنیشنل لا کے ابتدائی عناصر کا کھوج لگایا ہے۔ ایک مشہور ہندو مصنف ٹینڈن نے انٹرنیشنل لا پر ایک درسی کتاب مرتب کی ہے جس میں اس نے وید، گیتا اور رامائن سے بین الاقوامی تعلقات کے بہت سے اصول دریافت کیے ہیں۔ ان کاوشوں کی علمی اہمیت کے باوجود وید، گیتا اور رامائن کو بین الاقوامی قانون کی کتابیں قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اسی طرح بعض دوسرے مصنفین نے بائبل، تورات اور انجیل سے بین الاقوامی قانون کے احکام نکالے ہیں۔ ایسے احکام تورات میں خاصے زیادہ ہیں لیکن اس کے باوجود تورات کو بین الاقوامی قانون کی کتاب کوئی نہیں سمجھتا۔

یہی بات حمورابی اور جسٹی نین کے قوانین کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ ان دونوں مجموعوں میں سے بعض ایسے احکام نکالے جاسکتے ہیں جو ضابطہ کے قوانین یا بین الاقوامی قانون کے اصول قرار دیے جاسکیں لیکن ان دونوں مجموعوں کو بین الاقوامی قانون یا قانون ضابطہ کے مجموعے قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۸۔ فقہ التعمل الاجتماعی یا معاشرتی سطح پر میل جول اور طرز عمل کے احکام جن کے لیے الحظر والاباحتہ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، یعنی عام معاشرتی سطح پر کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز ہے۔ قانون کے اس شعبہ کا مقصد بنیادی طور پر اسلامی معاشرہ کے امتیازی اوصاف کا تحفظ اور اسلامی شخصیت کی بقا ہے۔ دنیا کے ہر نظام، ہر قانون اور ہر تہذیب کی طرح اسلام بھی اپنے نظام، قانون اور تہذیب کی انفرادیت کا تحفظ کرتا اور اس کے لیے مناسب اور ضروری تدابیر اختیار کرتا ہے۔ الحظر والاباحتہ کے احکام اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے ہیں۔ نہ صرف اسلام بلکہ دیگر مذاہب بالخصوص ہندومت اور یہودیت میں بھی ایسے احکام ملتے ہیں جن کا مقصد ان مذاہب کی انفرادیت کا تحفظ ہے۔

مزید برآں اسلامی معاشرہ ایک کثیرالعناصر معاشرہ ہے۔ یہ کثیرالعنصری (pluralism) لسانی، قبائلی، علاقائی اندازکی بھی ہے اور ثقافتی، بلکہ مذہبی اندازکی بھی۔ اسلامی تعلیمات میں جس طرح کے معاشرہ کا تصور ملتا ہے اس میں اہل ذمہ بھی ہوں گے، مستامنین اور معاہدین بھی ہوں گے۔ وہاں اہل کتاب اور آتش پرستوں کو بھی رہنے کی آزادی حاصل ہوگی، وہاں مختلف طبقات اور گروہوں کو اپنی اپنی لسانی، علاقائی اور ثقافتی انفرادیت کے تحفظ کی آزادی حاصل ہوگی۔ اس صورت حال کو معاشرتی سطح پر جس قانون کے ذریعہ منظم و منضبط کیا جائے گا وہ یہی فقہ المجتمع یا معاشرتی فقہ ہے۔

پھر اسلام ایک دعوتی دین ہے۔ اس میں ہر مسلمان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ دین کی تعلیم اور پیغام کو دوسروں تک پہنچائے۔ اس اعتبار سے اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو مسلسل وسعت پذیر ہے۔ اس کے پیروکاروں کی تعداد دنیا میں مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مذہب کے پیروکار اپنے کسی

خول میں بند نہیں رہ سکتے۔ دوسروں سے بیزار رہ کر کوئی وسعت پذیری کے اس تسلسل کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کا مزاج تفتح (کھلے پن) اور تنور (روشنی میں آنے) کا ہے انغلاق اور انظلام (بند اور تاریک ہونے) کا نہیں ہے۔ اس تفتح اور تنور کو اگر بالکلیہ آزاد چھوڑ دیا جائے تو یہ بہت جلد بے قابو ہو کر پورے اجتماعی نظام کو تباہ و برباد کر سکتا ہے، جیسا کہ حال ہی میں سوویٹ یونین کے تجربہ سے پتا چلتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ تفتح اور تنور کو مناسب حدود کا پابند بنایا جائے۔ یوں تو پوری شریعت ہی ایک پہلو سے ان حدود سے عبارت ہے لیکن خاص اجتماعی سطح پر الحظر و الاباحتہ کے احکام کی صورت میں یہی حدود متعین کی گئی ہیں۔

دنیا کے بعض مذاہب (مثلاً یہودیت اور ہندومت) میں یہ احساس بڑی شدت سے پایا جاتا ہے کہ اگر ان کے نظام میں دوسری تہذیبوں اور نظریات کو آزادی دی گئی تو اس سے ان کی انفرادیت متاثر ہوگی یا ان کا تشخص مجروح ہوگا۔ اس لیے وہ دوسرے نظریات اور تہذیبوں کے بارے میں بڑا غیر مصالحانہ اور جنگجویانہ رویہ رکھتے ہیں۔ بابری مسجد اور حرم ابراہیمی کے واقعات سے اس کی تائید ہوسکتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام کو ایسا کوئی خطرہ نہیں۔ نہ دوسروں کے ساتھ رہنے سے اس کی انفرادیت ختم ہوتی ہے اور دوسرے مذاہب کو آزادی دینے سے اس کا اپنا تشخص مجروح ہوتا ہے۔ اسلام کی دعوت تمام بنی آدم کے لیے عام ہے۔ اس کے ضابطہ میل جول میں ہر گروہ اور ہر مذہب کے ماننے والوں سے میل جول کی گنجایش موجود ہے۔ میل جول کے اس ضابطہ کو ایک کثیر العناصر انسانی معاشرہ کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس ضابطہ میں کھانے پینے کے آداب، حلال و حرام کی تفصیلات، عام معاشرتی سطح پر افراد کا میل جول، غیر مسلموں ~~سے~~ روابط کے انداز، شادی بیاہ کے طریقے اور حدود، لباس اور پردہ کے احکام، رہن سہن کے اصول و قواعد، عام برتاؤ اور اس جیسے دیگر امور سے بحث کی جاتی ہے۔

یہ تھا اسلامی قانون کا ایک مختصر سا موضوعاتی جائزہ۔

اس جائزے سے چند باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں: پہلی بات یہ کہ انسانی زندگی کے اہم اور بڑے پہلوؤں میں سے کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو انسان کے ظاہری اعمال-- اقوال و افعال سے--- تعلق رکھتا ہو اور وہ فقہ اسلامی کے مذکورہ بالا آٹھ شعبوں میں سے کسی شعبہ میں شامل نہ ہو۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی زندگی کی ہر سرگرمی کے بارے میں اسلامی شریعت ایک واضح موقف رکھتی ہے جس کے مطابق وہ سرگرمی وقوع پذیر ہونی چاہیے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے یا اسلام زندگی کے تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے تو اس سے ہماری مراد یہی ہوتی ہے۔ اسلام مذکورہ بالا تمام معاملات و مسائل کے حل کے لیے ہدایات فراہم کرتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اسلامی قانون کے یہ سارے شعبے اس طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان سب شعبوں میں وہی تعلق ہے جو ایک زندہ جسم کے اعضا میں ہوتا ہے۔ ان تمام شعبوں میں ایک ہی روح کارفرما ہے جو شروع سے آخر تک تمام احکام و مسائل میں جاری اور ساری ہے۔ ان سب شعبوں میں خیالات و تصورات کی ایک یکسانیت اول سے آخر تک ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ان تمام شعبوں کے احکام کو جو بنیادی اصول و قواعد مرتب کرتے ہیں وہ ایک ہی ماخذ و مصدر سے لیے گئے ہیں۔ لہٰذا فقہ اسلامی ایک ایسی وحدت ہے جس کے مختلف حصوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔

تیسری بات یہ کہ اسلامی قانون بیک وقت ایک خالص مذہبی قانون بھی ہے اور عدالتی اور ملکی قانون بھی۔ اس میں ایک مذہبی قانون کے تمام مثبت اور صحت مند عناصر موجود ہیں لیکن دنیا کے دیگر مذہبی قوانین میں در آنے والی خرابیوں سے پاک ہے۔ اسی طرح اس میں کسی بھی ریاستی اور عدالتی قانون میں پائے جانے والے تمام مثبت اور صحت مند عناصر موجود ہیں اور یہ ان خرابیوں سے مبرا ہے جو دوسرے سیکولر نظاموں کا خاصہ ہیں۔

دنیا کے دیگر رائج الوقت قوانین یا تو خالص مذہبی قوانین یا خالص ریاستی اور عدالتی نوعیت کے ہیں جن کی بنیاد کسی رواج، کسی بادشاہ کے حکم یا کسی بالاتر مقتدرہ کے فیصلہ پر ہوتی ہے۔ لیکن اسلامی قانون ان دونوں سے الگ اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ ایک مذہبی قانون ہونے کی حیثیت سے ہر مسلمان اس پر عمل کرنے کا پابند ہے۔ وہ اس پر اپنے ایمان اور عقیدے کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے عمل کرتا ہے اور اس عمل در آمد کے لیے کسی بیرونی قوت کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسلامی قانون کو ماننے والے ایک معاشرہ میں کسی پولیس یا عدالت سے بھی پہلے انسانوں کا ضمیر ان کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ رات کی تاریکیوں میں بھی قانون پر عمل در آمد کریں۔ وہاں یہ اعلان کافی ہے کہ آج سے اللہ تعالیٰ نے شراب حرام کر دی ہے اور لمحہ بھر کے اندر اندر شہر کی گلیوں میں بارش کے پانی کی طرح شراب بہتی نظر آتی ہے۔ وہاں یہ بتا دینا کافی ہوتا ہے کہ آج سے سود حرام کر دیا گیا ہے اور اگلے دن سے لوگ ایسے ہر کاروبار سے احتراز کرنے لگ جاتے ہیں جس میں سود کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔ وہاں جرم کے ارتکاب کے بعد مجرم خود بار بار آکر ریاست سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس کو سزا دے کر پاک کر دیا جائے۔

یہ قانون کی وہ روح ہے جو انسان کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ قانون پر سچے دل سے عمل در آمد کا یہ جذبہ صادق اس کے رگ و پے میں سما جاتا ہے۔ اس پر جو چیز عمل در آمد کراتی ہے وہ تقویٰ اور خوف الٰہی کا جذبہ ہے۔ لیکن اس کو محض انسانوں کے مذہبی جذبہ پر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے بلکہ

اس اندرونی قوت کی تکمیل بیرونی قوت سے کرنے کا سامان بھی کر دیا گیا ہے۔ ریاستی قوت اور عدالتی اداروں کے ذریعہ قانون شکنوں سے عہدہ برآ ہونے کا بندوبست بھی شریعت میں موجود ہے۔ اس طرح ریاست اور مذہب ایک دوسرے کے معاون و مددگار بن جاتے ہیں۔ نہ ریاست مذہب کی راہ نمائی سے مستغنی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور نہ مذہب ریاست کے وسائل سے مستغنی ہو کر فراریت کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو سیدنا عثمان غنیؓ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا: الاسلام اس و السلطان حارس یعنی اسلام ایک بنیاد ہے (جس پر مسلمانوں کی زندگی کی عمارت استوار ہے) اور حکومت ایک نگہبان ہے۔ اگر کسی عمارت کی بنیاد نہ ہو تو وہ عمارت گر جاتی ہے اور اگر کسی عمارت کا نگہبان نہ ہو تو وہ ضائع ہو جاتی ہے' اس کو لوٹ لیا جاتا ہے' اس پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔

اسلام کی بقا اور مسلمانوں کی وحدت ملی کے تحفظ کے لیے دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ عصا نہ ہو تو کلیسی ہے کار بے بنیاد۔ یہ توازن اور دین و دنیا کا یہ حسین امتزاج ہی اسلام کا سب سے بڑا طرہ امتیاز ہے۔ بہت سے لوگوں کو اس امتزاج کو سمجھنے میں دقت ہوئی ہے۔ وہ اس کے ایک پہلو پر غور کرتے ہیں تو اس کو سیکولر نظام سے مشابہ پاتے ہیں' دوسرے پہلو پر نظر ڈالتے ہیں تو اسے ایک خالص روحانی اور مذہبی عقیدہ سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن اگر ان دونوں پہلوؤں پر نظر ہو تو پھر اسلام کا اعتدال و توازن سامنے آتا ہے جو انسانی مزاج اور طبیعت سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

چوتھی بات جو اسلامی قانون کی تاریخ کا معمولی مطالعہ رکھنے والا بھی جانتا ہے یہ کہ یہ قانون بنیادی طور پر ایک غیر سرکاری قانون ہے۔ یہ ایک ایسا قانون ہے جس کے بنانے' مرتب کرنے اور توسیع دینے میں کبھی کسی ریاست کی مداخلت نہیں ہوئی۔ اس قانون کی تکمیل میں' اس کے نفاذ میں' حتیٰ کہ اس کے لیجسلیٹ کرنے میں ریاست کا کبھی بھی براہ راست دخل نہیں رہا۔ یہ قانون خود بخود غیر سرکاری طور پر ایک خالص پرائیویٹ قانون سازی کے نتیجہ میں سامنے آیا ہے۔ بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ کوئی قانون ریاست سے بالا بالا محض پرائیویٹ قانون سازی کے نتیجہ میں تیار ہو جائے۔ لیکن اسلامی قانون کا مزاج یہی ہے کہ وہ اپنے روز آغاز سے لے کر اپنی پوری تاریخ کے دوران ریاست کی مداخلت اور بڑی حد تک سرکاری اثرات سے آزاد رہا ہے۔ آج بھی یہ ایک حد تک پرائیویٹ قانون ہے۔ اس کے متعدد شعبوں میں آج بھی پرائیویٹ طور پر عمل درآمد ہو رہا ہے اور غیر سرکاری اہل علم اجتہاد اور افتا کے ذریعے ضروری مسائل میں "قانون سازی" کر رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ سب کام کسی باقاعدہ قانون ساز ادارہ کے بغیر کیسے ہو رہا ہے اور کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا غیر سرکاری قانون سازی کا نتیجہ کسی افراتفری کی شکل میں نہیں نکلے گا؟ ان سوالات کا جواب

بڑی آسانی سے مل سکتا ہے اگر اسلامی قانون کی تاریخ اور اجتہاد و اجماع کے ارتقا کو پیش نظر رکھا جائے۔

جب سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے تو اسلامی قانون کی تمام بنیادیں فراہم ہو چکی تھیں، دین مکمل کیا جا چکا تھا اور نعمت تمام ہو چکی تھی۔ قرآن پاک کی صورت میں ہدایت الٰہی تحریری طور پر صحیفوں میں اور زبانی طور پر ہزاروں نفوس قدسیہ کے سینوں میں موجود تھی۔ سنت رسولؐ کی صورت میں کتاب الٰہی کی عملی تعبیر و تشریح انسانوں کے سامنے پیش کر دی گئی تھی۔ قرآن و سنت کی اقدار و مقاصد کی علمبردار اور شریعت کے احکام کی خارجی تشکیل یعنی جماعت صحابہ کی اجتماعی زندگی کی شکل میں اس پر اجتماعی اور ریاستی عمل درآمد کی مثال فراہم کر دی گئی تھی۔ یہ وہ بنیادیں تھیں جن پر آیندہ اسلامی قانون کی وسیع و عریض اور بے مثال عمارت کو استوار ہونا تھا۔

اب قانون سازی اور توسیع قانون کی صورت یہ ہوئی کہ جب کوئی نیا مسئلہ پیش آیا جس میں نئی "قانون سازی" یا نئی راہ نمائی کی ضرورت پیش آئی، تو یہ قانون سازی یا نئی راہ نمائی کسی سرکاری یا ریاستی پلیٹ فارم کے بجائے اصحاب علم و تقویٰ مجتہدین کی طرف سے پیش کی گئی۔ فقہائے مجتہدین نے ہر پیش آمدہ مسئلے پر غور کیا اور اپنی انتہائی فہم و بصیرت کے بموجب اس کا شرعی اور اسلامی حل دریافت کرنے کی مقدور بھر سعی کی اور جو حل دلائل کی روشنی میں سمجھ میں آیا وہ امت کے سامنے پیش کر دیا۔ اس سارے عمل میں ان کا اولین و آخرین محرک خوف خدا اور آخرت کی جواب دہی کا احساس تھا۔ قرآن پاک نے اصحاب علم کی یہ ذمہ داری قرار دی ہے کہ وہ علم کو چھپانے سے اجتناب کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرورت کے موقعہ پر علم کو چھپانے اور مطلوبہ راہ نمائی فراہم نہ کرنے والے عالم کو گونگا شیطان قرار دیا ہے۔

ان احکام کی رو سے ہر صاحب علم شخص پابند ہے کہ جب بھی ضرورت پیدا ہو وہ اپنا علم امت کے سامنے پیش کرے اور قرآن و سنت کے دلائل کی روشنی میں اپنا دریافت کردہ حل سامنے لائے۔ اس طرح بہت سے حل اور تجاویز سامنے آئیں گی۔ اور دوسرے فقہا اس پر تبصرہ کریں گے، یوں دلائل اور جوابی دلائل کی بنیاد پر ایک قومی اور ملی مباحثہ ہو گا اور یا تو تمام فقہا کسی ایک رائے پر متفق ہو کر اس رائے کو اختیار کر لیں گے یا دو تین آرا اختیار کر لی جائیں گی اور امت جس فقیہ کے دلائل، علم اور تقویٰ سے متاثر ہو گی اس کی رائے پر عمل کرنے لگے گی اور اس طرح وہ قانون ملکی کا جز بن جائے گی، عدالتیں اس کے مطابق فیصلے صادر کرنے لگیں گی اور اصحاب افتا اس کے بموجب فتوے دینے لگیں گے۔

"قانون سازی" کا یہی طریقہ صدر اسلام میں شروع ہوا اور کم و بیش تیرہ سو سال تک جاری

رہا۔ اس پورے دور میں کبھی بھی حکومت وقت یا حکمرانوں کو اس عمل پر اثر انداز ہونے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حکمرانوں اور حکومتوں نے "قانون سازی" کے اس عمل پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کی' بلاشبہ مختلف حکمرانوں نے مختلف مقاصد و محرکات مثبت اور منفی دونوں کے تحت "قانون سازی" کے اس کام کو اپنے ڈھب کے مطابق ڈھالنے کی کوششیں کیں لیکن ایسی قریب قریب تمام ہی کوششیں ناکام رہیں۔ حکمرانوں یا کسی بھی بااثر طبقہ یا فرد کے مفاد کی خاطر دیے جانے والے کسی فتویٰ کو کبھی بھی امت نے قبول نہیں کیا اور نہ ایسا فتویٰ کبھی شریعت کی معتبر و مستند تعبیر مانا گیا۔ امت کے اجتماعی ضمیر اور اسلامی خمیر نے وہی بات قبول کی جو قرآن و سنت کے احکام سے ہم آہنگ تھی اور اس بات کا کہنے والا علم اور تقویٰ کی میزان میں کھرا قرار پایا تھا۔

یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ جن مجتہدین کے اجتہادات اور جن مفتیوں کے فتوے امت میں مستند اور معتبر ٹھہرے اور جن کی "قانون سازی" کو عدالتوں کے ججوں سے لے کر عامتہ الناس نے قبول عام سے نوازا' وہ سب کے سب نہ صرف پرائیویٹ شہری تھے اور کوئی سرکاری منصب نہیں رکھتے تھے بلکہ بعض صورتوں میں وہ اپنے اپنے معاصر حکمرانوں کی نظر میں ناپسندیدہ شخصیت بھی تھے۔ امام ابو حنیفہ جن کو دنیا کی تاریخ کے چند عظیم ترین قانونی دماغوں میں شمار کیا جاتا ہے اور جن کی تعبیر قانون کو دنیائے اسلام کا دو تہائی کے قریب حصہ تسلیم کرتا آیا ہے' کسی پارلیمنٹ کے رکن نہیں تھے۔ امام احمد بن حنبل جن کے فقہی اقوال آج سعودی عرب میں قانون کی حیثیت سے نافذ ہیں' ان کو کسی حاکم نے قانون سازی کے کام پر مامور نہیں کیا تھا۔ امام جعفر صادق کسی لا کمیشن کے رکن نہیں تھے۔ یہ اور ان جیسے سیکڑوں مجتہدین امت' ریاست کے عام شہری تھے لیکن ان کے اقوال اور تعبیرات قانون کو ان کے ہم عصر حکمرانوں اور قاضیوں نے اسی بنیاد پر تسلیم کر کے نافذ کیا جس بنیاد پر آج دنیا کے سوا ارب مسلمان ان کے فقہی اقوال اور تعبیرات قانون پر عمل پیرا ہیں۔

ان حضرات نے نہ صرف قانون کے میدان میں نئے نئے پیش آمدہ مسائل پر غور کر کے ان کا اسلامی حل تجویز کیا بلکہ ہزاروں لاکھوں مسائل کے پیش آنے سے پہلے ہی ان کا پیشگی اندازہ کر کے ان کا بھی حل تجویز کر دیا۔ ان کی فکر واقعات اور تاریخ کے ساتھ نہیں' واقعات اور تاریخ سے بہت آگے تھی۔ انھوں نے ان تمام آرا اور تجاویز کی تائید میں مکمل عقلی اور نقلی دلائل پیش کیے۔ ان میں جس جس کے علم اور تقویٰ پر جس جس کو جتنا اعتماد تھا' وہ اس حد تک ان کے اقوال کو شریعت کی جائز اور مستند تعبیر تسلیم کر کے قبول کرتا گیا۔ اگر وہ حکمران تھا تو اس نے اس کے مطابق حکمرانی کی۔ اگر وہ قاضی تھا تو اس نے ان اقوال کے مطابق مقدمات فیصل کیے' اگر وہ عام آدمی تھا تو اس نے اپنی روز مرہ زندگی میں ان پر عمل درآمد کیا۔ اگر وہ قانون کا استاذ تھا تو اس نے تدریس قانون میں ان اقوال و

اجتہادات کو بنیاد بنایا۔

اسلام کی تاریخ کے ابتدائی بارہ سو سال میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی حکمران نے حکمرانی کے زور پر کوئی قانون بنا کر نافذ کر دیا ہو اور اس کو امت نے قبول بھی کر لیا ہو' یا کسی حکمران نے باہر سے کوئی قانون درآمد کر لیا ہو۔ قانون کے معاملہ میں مسلمان خود کو اتنا خود کفیل بلکہ اعلیٰ اور برتر سمجھتے تھے کہ انھوں نے محض علمی دلچسپی کی خاطر بھی قانون کی کسی کتاب کا کسی دوسری زبان سے عربی میں ترجمہ نہیں کیا۔ دوسری صدی ہجری سے لے کر آیندہ کئی سو سال کے عرصہ میں فلسفہ' عقلیات' منطق' طب' ادب وغیرہ کی ہزارہا کتابیں سنسکرت' یونانی' فارسی' آرامی اور دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمہ کی گئیں لیکن قانون یا دستور کی کسی کتاب کا ترجمہ کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ سوائے اس کے نہیں کہ قانون مسلمانوں کے ضمیر اور خمیر کا ایک جزو تھا۔ وہ معاشرہ یا ریاست کی تخلیق نہیں تھا بلکہ ریاست اور معاشرہ قانون کی تخلیق تھے۔

دنیا میں ریاست پہلے وجود میں آتی ہے' قانون بعد میں وجود میں آتا ہے۔ اسلام میں قانون پہلے وجود میں آیا اور ریاست بعد میں اس لیے وجود میں آئی کہ اس قانون کو نافذ کرے اور اس کی حفاظت کرے' اسلامی ریاست کا قانونی جواز (legitimacy) ہی اس وقت تک ہے جب تک وہ اس قانون کو نافذ کرتی ہے۔ بصورت دیگر ریاست اپنا قانونی جواز اور مقصد وجود کھو بیٹھتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں تشریف آوری سے قبل' قیام ریاست سے بہت پہلے' قانون کے مبادی اور اساسی تصورات بیان فرما دیے تھے۔ آیندہ' ریاست کے ''مابعد اصول قانون'' یعنی metajurisprudence کے اصول عطا فرمائے تھے۔ انھی اصولوں اور تصورات کی حفاظت کے لیے قانون دیا جانا تھا۔ اور اسی قانون کے نفاذ اور تحفظ کے لیے ریاست کے قیام کی ضرورت پیش آئی تھی۔

آج مسلمانوں کا المیہ یہی ہے کہ ان کی قومی ریاستیں موجود ہیں لیکن ان کے حکمرانوں نے اسلامی قوانین نافذ نہیں کیے۔ آج مسلمانوں کے دلوں میں جو طوفان بپا ہے وہ اسی تڑپ کا ایک مظہر ہے جو وہ اسلامی قانون کے لیے رکھتے ہیں۔ آج دنیائے اسلام میں جو اضطراب پایا جاتا ہے اس کا اصل سبب یہی ہے کہ مسلمانوں کی قومی ریاستیں ریاست کے مقصد وجود پر عمل پیرا نہیں ہیں۔ آج کا مسلمان کسی مبہم تصور کے پیچھے سرگرداں نہیں ہے۔ وہ کسی غیر طے شدہ قانون کا مطالبہ نہیں کرتا' وہ کسی موہوم ہدف کی تلاش میں پریشان نہیں ہے۔ اس کا ہدف واضح' اس کی منزل متعین اور اس کا تصور ایک طے شدہ اور دو ٹوک نظریہ سے عبارت ہے۔ وہ جس راستہ کا مسافر ہے وہ اتنا روشن اور صاف ہے کہ وہاں رات کو بھی دن کا سماں رہتا ہے (لیلھا کنھا رھا)۔

آج مغرب نے قانون سازی کی یہ آزادی سلب کر لی ہے۔ اس نے عامتہ الناس اور آزاد

باکردار اہل علم و دانش کا یہ فریضہ ہتھیا کر ایک مفاد پرست طبقہ کے ہاتھ میں دے دیا ہے جو اس کو طبقاتی مفادات کی تکمیل کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ دنیائے اسلام میں آج جو کشمکش برپا ہے وہ دراصل قانون کو غصب کر لینے والوں اور قانون کی آزادی اور اسی طرح مساوات کا مطالبہ کرنے والوں کے درمیان آویزش کا دوسرا نام ہے۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی بارہ سو سال کے دوران قانون سازی کا یہ کام کسی نام نہاد ادارہ کی اجارہ داری نہیں رہا۔ بلکہ یہ کام ایک ایسے قومی اور عوامی عمل کے ذریعہ ہوتا رہا جس میں عامتہ الناس نے براہ راست حصہ لیا اور اپنے اجتماعی عمل اور اجتماعی فیصلہ سے فقہا کے اجتہادات کو قانون کی شکل دے دی۔ اس عمل میں وہ تمام مثبت پہلو موجود تھے جو افلاطون کے دور سے آج تک مختلف نظریات ساز فلاسفہ اور حکما حکومت کے بارے میں بیان کرتے آئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عامتہ الناس کی براہ راست قانون سازی اور کامل مساوات کی ضمانت بھی اس عمل کے ذریعہ حاصل رہی۔

اسلامی تاریخ میں شوریٰ بھی رہی، اہل اختیار کے ادارے بھی رہے لیکن ان میں سے کسی کو بھی قانون سازی کا کوئی inherent اختیار کبھی بھی حاصل نہیں ہوا۔ ان اداروں کو دور جدید کی پارلیمنٹ کا پیش رو قرار دینا بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اسلامی تاریخ میں مغرب کے اثرات سے پہلے کبھی بھی قانون سازی کے لیے کوئی سرکاری یا فارمل ادارہ وجود میں نہیں آیا۔ مسلمانوں کے مزاج نے ایسے اداروں کے قیام کو آزادی قانون کی روح کے خلاف سمجھا۔ امام مالک نے اسی لیے عباسی خلفا کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا تھا کہ ان کی موطا کو ملکی قانون کا درجہ دے دیا جائے۔ امام مالک نے اپنی ذاتی شہرت اور دنیاوی کریڈٹ کو یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس سے فقہا کی وہ آزادی محدود ہو جائے گی جو اسلام نے ان کو دی ہے۔

ممکن ہے آج بعض حضرات کو یہ سمجھنے میں دقت ہو کہ ریاست کے ٹھپے کے بغیر قانون کیسے بن اور چل سکتا ہے۔ اس دقت کی ایک وجہ تو وہ تصورات اور رواجات ہیں جو آج مغربی روایات کے اثر سے ہمارے ہاں عام ہو گئے ہیں جن کی رو سے قانون وہی ہے جو کسی فرماں روا یا بالاتر حکمران نے جاری کیا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کے اس خصوصی مزاج پر غور نہیں کیا گیا۔ ذرا توجہ سے دیکھا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ آج بھی دنیائے اسلام میں اسلامی قانون کے ایک بڑے حصہ پر کسی سرکاری مداخلت اور ریاستی اثر و رسوخ کے بغیر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ ابھی میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی قانون کا ایک بڑا حصہ عبادات، مناکحات، معاملات اور الحظر و الاباحتہ کے اہم موضوعات پر مشتمل ہے۔ دنیا کا ہر مسلمان ان امور سے متعلق بہت سے اسلامی احکام پر عمل کرتا ہے اور ان احکام کو واجب التعمیل سمجھتا ہے۔ ان امور سے متعلق نئے نئے فتاویٰ بھی آتے رہتے ہیں، نئے نئے پیش آمدہ مسئلہ کے بارے میں نئی "قانون سازی" بھی ہوتی رہتی ہے اور اس کا طریقہ کار وہی ہے جو اوپر بیان

کیا گیا کہ پرائیویٹ ماہرین مجوزہ حل قوم کے سامنے دلائل سے پیش کرتے ہیں اور جس ماہر کے علم اور تقویٰ پر قوم کے جس حصہ کو اعتماد ہوتا ہے وہ حصہ اس حل کو قبول کر کے اس پر عمل کرنا شروع کر دیتا ہے اور جب ایسا کوئی معاملہ عدالت میں پیش آتا ہے تو عدالت کے روبرو ایسے تمام ماہرین کی آرا اور ان کے تجویز کردہ حل مع دلائل دیے جاتے ہیں۔ پھر جس رائے سے عدالت مطمئن ہو اس کی بنیاد پر وہ معاملہ کا فیصلہ کر دیتی ہے۔

آج حکومت کی طرف سے کوئی قانون ادائیگی نماز یا قانون تکمیل روزہ، قانون ادائیگی فریضہ حج، قانون لباس، معاشرت لیکٹ یا خوراک آرڈیننس موجود نہیں ہے۔ بلاشبہ ان موضوعات کے بارے میں اسلام کا قانون موجود ہے جس میں اضافہ اور توسیع بھی ہوتی ہے اور نئے نئے قوانین بھی بنتے رہتے ہیں۔ پرانے قوانین پر نظر ثانی کا عمل بھی جاری رہتا ہے اور عامتہ الناس ان قوانین پر دنیا بھر میں عمل درآمد بھی کرتے رہتے ہیں لیکن اس سارے عمل میں کسی حکومت، حکمران، ریاستی ادارہ یا کسی اسمبلی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ایک مسلمان اپنے دین و ایمان کے مطابق جس کام کو حلال سمجھتا ہے، اس کو اختیار کرتا ہے اور جس چیز کو حرام سمجھتا ہے اس سے اجتناب کرتا ہے۔ جہاں شبہ ہوتا ہے وہاں کسی صاحب علم و تقویٰ سے جاکر پوچھ لیتا ہے اور دستیاب اصحاب علم و تقویٰ میں سے جس کے علم و تقویٰ پر اس کو اعتماد ہو، اس کی بات پر عمل کرتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں اس کی درجنوں مثالیں موجود ہیں کہ کسی معاملہ میں حکومتوں اور فرماں رواؤں نے ایک رائے اختیار کی اور اصحاب علم و تقویٰ نے اس کے خلاف رائے دی۔ عوام نے حکومتوں اور فرماں رواؤں کی رائے کو مسترد کر دیا اور اصحاب علم و تقویٰ کی رائے کو اختیار کر لیا۔ بعض لوگ اسلامی قانون کو عرب ملوکیت سے متاثر بتاتے ہیں جو سراسر ناواقفیت کی دلیل اور واقعات کے قطعی طور پر منافی ہے۔ ممکن ہے کسی ایک آدھ جزوی معاملہ میں کسی فقیہ نے کسی حکمران کی رعایت سے اپنے فتویٰ میں نرمی کر دی ہو، لیکن ایسے فتاویٰ کو کبھی بھی رواج اور قبول عام حاصل نہیں ہو سکا۔ سرکاری اثرات سے آزادی، اقتدار و حکومت کے مقابلہ میں مکمل خود مختاری اور ریاستی بالادستی سے انکار فقہ اسلامی کی سب سے نمایاں امتیازی خصوصیت ہے۔ اس خصوصیت میں دنیا کا کوئی ترقی یافتہ قانون فقہ اسلامی کا شریک و سہیم نہیں۔

یہ فقہ اسلامی کا ایک نہایت سرسری اور عمومی تعارف ہے اور یہ چند بنیادی خصوصیات ہیں جو فقہ اسلامی کو دنیا کے دوسرے متمدن اور ترقی یافتہ قوانین سے ممتاز کرتی ہیں۔

و اخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین

56

ADARTS - HRA - 1/94